# نبوّت کی ضرورت

(عبد الحمید صدیقی)

انسانی عقل وخرد نے غور وفکر کے لیے جو مختلف موضوعات تلاش کیے ہیں اُن میں ایک اہم موضوع وحی والہام کا بھی ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں بعض لوگ ایسے پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے نبوت کی نفی کی اور اس امر کا دعویٰ کیا کہ تنہا عقل انسانی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے کافی ہے اور انسان کسی وحی والہام کا محتاج نہیں۔

ان انکار کرنے والوں میں بھی فکر و نظر کی کوئی ہم آہنگی نہیں۔ ان کے درمیان عجیب و غریب قسم کے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ جس کیفیت کو ہم وحی والہام سے تعبیر کرتے ہیں وہ عقل سے الگ کوئی قوت نہیں بلکہ عقل ہی کی ایک پاکیزہ صورت ہے۔ عقل انسانی جب نفسانی خواہشات سے پاک و منزہ ہو جاتی ہے تو وہ وحی والہام کا روپ دھار لیتی ہے یا دوسرے لفظوں میں عقل سے جب خود غرضی، شہوانیت، غیظ و غضب، انانیت، اور حرص و ہوا کی میل کچیل دور ہو جاتی ہے تو باقی جو کچھ پاکیزہ اور مصفیٰ صورت میں بچ جاتا ہے وہ وحی والہام کہلانے لگتا ہے۔

دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ الہام اور عقل کے درمیان جو کچھ فرق ہے وہ کیفیت و نوعیت کا نہیں بلکہ مدارج کا ہے۔ سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کی نچلی سطح کو عقل سے تعبیر کیا جاتا ہے اور یہی انسانی قوت جب نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے تو لوگ اسے وحی والہام کے نام سے موسوم کر دیتے ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک وحی عقل انسانی ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ فرق معلوم ہوتا ہے وہ محض نظر کا دھوکا ہے۔ بعض انجان لوگ

عقل کی بلندیوں کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ جاتے ہیں اور اس بلندی سے جو کچھ کہا جاتا ہے چونکہ اُن کی ناقص عقل اُس کی کوئی معقول توجیہ نہیں کر سکتی، اس لیے وہ بے بسی کے عالم میں پکار اٹھتے ہیں کہ کوئی مافوق البشر قوت ذہین انسانوں سے ہمکلام ہو کر انہیں ایسی عجیب و غریب باتیں بتا دیتی ہے جو عام انسانوں کے حد ادراک سے بالعموم ورا ہوتی ہیں۔ اس نظریہ کی رُو سے وحی و الہام عقل سے کوئی جدا قوت نہیں بلکہ اسی کا نقطۂ کمال ہے۔

تیسرا گروہ جو متصوفین پر مشتمل ہے وحی و الہام کا رشتہ عقل و فکر سے جوڑنے کی بجائے وجدان و احساس سے جوڑتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگرچہ وحی و الہام میں عقلی عنصر داخل کرنے کی کوشش ہمیشہ کی گئی ہے۔ اور انسان جب تک انسان ہے وہ اپنی قلبی واردات اور وجدانی کیفیات کے لیے دلیلیں ڈھونڈتا رہے گا لیکن وحی و الہام کو علمیت اور عقلیت کی خراد پر اتارنے کی کوشش کے باوجود، نفسیاتِ الہام کا مطالعہ انسان کو جس نتیجہ پر پہنچاتا ہے وہ یہی ہے کہ جس چیز کو اصحابِ خرد وحی سے موسوم کرتے ہیں۔ اُس کا تعلق دماغ سے کہیں زیادہ دل سے ہے اور اس بنا پر یہ ہر شخص کی "جذبی اور تاثری حیات شاعر" کا ایک راز ہے، یہ سراسر ایک باطنی کیفیت ہے، اس کی جڑیں اگر کہیں ملیں گی تو صرف تاثرات کی گہرائیوں میں جو لوگ عقلیت کے ریگزاروں میں وحی و الہام کے چشموں کی تلاش کرتے ہیں۔ اُن کی حیثیت محض حکایت تشنہ و سراب کی ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں بھی لوگوں نے صوفیا کی وارداتِ قلبی اور انبیاء کی الہامی کیفیات میں ایک واضح خطِ امتیاز کھینچا ہے۔

(۱) صوفیانہ کیفیت نفس کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ناقابلِ اظہار اور ناقابلِ بیان ہوتی ہے۔

دلِ من داند و من دانم و داند دلِ من

اس کے برعکس انبیاء پر جب کبھی بھی الہامی کیفیات طاری ہوتی ہیں تو وہ انہیں

الہامی الفاظ ہی میں بیان کرتے ہیں۔

(۲) پھر صوفیانہ کیفیت نفسی بالکل عارضی اور خواب آسا ہوتی ہے۔ وہ بجلی کی طرح کوند کر غائب ہو جاتی ہے اور اس کے بعد کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی۔ لیکن اس کے برخلاف انبیاءؑ علیہم السلام کی الہامی کیفیات زیادہ پائیدار ہوتی ہیں اور اُن کے نتائج ہر لحاظ سے مستقل اور ابدی ہوتے ہیں۔ وہ ان کیفیات کے نتیجہ میں جو چیز نوعِ انسانی کو دیتے ہیں وہ انسانیت کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے۔ آج دنیا میں اخلاقی اقدار کے نام سے جو کچھ یہاں موجود ہے وہ سب انبیاء کی الہامی کیفیات کی رہینِ منّت ہے۔

شعورِ ولایت اور شعورِ نبوت میں خواہ کتنا اختلاف ہو لیکن اس طرزِ خیال کے حامی ان دونوں کیفیات کو "داخلی واردات" کی ہی دو مختلف صورتیں تصوّر کرتے ہیں۔ جس طرح عقل کے پرستار وحی والہام کو عقل ہی کی ایک ارتقائی منزل بتاتے ہیں بالکل اسی طرح متصوفین کا یہ دعویٰ ہے کہ وحی والہام باطنی کیفیات کی ایک نہایت اعلیٰ اور ارفع صورت ہے جس میں انسان کی خواہشاتِ نفس کا قطعًا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔

مندرجۂ بالا تین گروہوں میں خواہ نقطۂ نظر کا کتنا ہی اختلاف ہو لیکن ان میں بہرحال ایک چیز قدرِ مشترک ضرور ہے کہ وہ وحی والہام کو لازمی طور پر ایک اعلیٰ چیز سمجھتے ہیں۔ اگر ایک کے نزدیک اس کا تعلق عقلِ انسانی سے ہے، تو وہ اسے ہی اُس کا نقطۂ عروج سمجھتا ہے اور دوسرا اگر اس کے ڈانڈے "من کی دنیا" سے ملاتا ہے تو وہ بہرحال اس بات کا ضرور قائل ہے کہ اس "دنیا" کے جو مقدس ترین مقامات ہو سکتے ہیں وحی والہام کا مقام اُن سب میں مقدس ہے۔

پھر دونوں اس امر پر بھی متفق ہیں کہ وحی کا رشتہ خواہ عقل سے ہو یا قلب سے، اس سے انسان کے اندر ایک خاص قسم کی بصیرت ضرور پیدا ہوتی ہے جس کی مدد سے نبی حیاتِ انسانی کے اُن سربستہ رازوں کی نقاب کشائی کرتا ہے جو عام حالات میں عقل و وجدان کرنے

سے عاجز ہوتے ہیں۔ زندگی کے وہ پیچیدہ مسائل جو انسانی حدِ ادراک سے ماوراء ہیں نبی انہیں اشاروں اشاروں میں سمجھا دیتا ہے۔ اُس کے علمی نکات میں، فکری استدلال میں اور وجدانی کیفیات میں اعجاز کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ اور جو شخص بھی تعصب اور تنگ نظری سے ہٹ کر اُس کی زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے وہ اسے ہر لحاظ سے کامل و اکمل پاتا ہے اور اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ کسی عام انسان کی زندگی نہیں جس سے صرفِ نظر کیا جا سکے۔ نبی کو عقیدت و احترام کے ساتھ دیکھنے سے دیدۂ دل وا ہوتا ہے اور اُس کی باتوں کو جذب و شوق کے ساتھ سننے سے کان ایسے بیش قیمت حقائق سے آشنا ہوتے ہیں جن کی وجہ سے انسانی زندگی میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔

لیکن ان تینوں گروہوں کے علاوہ حال ہی میں ایک گروہ ایسا بھی پیدا ہوا ہے جو نہ صرف وحی و الہام کی ضرورت کا منکر ہے بلکہ اس نے اُسے ہر قسم کے طعن و تشنیع کا ہدف بھی بنا رکھا ہے۔ اُس گروہ کے افراد نے غلطی سے نبی اور متصوف کے درمیان جو عظیم فرق ہے سب سے پہلے اُسے نظر انداز کیا اور پھر مغربی متصوفین کی قلبی واردات اور وجدانی کیفیات کا بالکل سطحی اور سرسری مطالعہ کر کے یہ سمجھ لیا کہ انبیاء اپنی جن کیفیات کو الہامی کہتے ہیں وہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے قلندرانہ وجد و حال کی سی ایک کیفیت ہے اور چونکہ اکثر دماغی امراض میں بلعینہٖ وہی مظاہر نظر آتے ہیں جو صوفیانہ کیفیاتِ نفسی میں ہیں مثلاً التباس کی حالت میں آدمی نئی نئی شکلیں دیکھتا ہے اور عجیب و غریب آوازیں سنتا ہے، صرع کی حالت میں بھی خاص خاص احساسات ہوتے ہیں، ہسٹیریا کی حالت میں رقتِ قلب بڑھ جاتی ہے اور فقدانِ حس کی صورت میں اعضائے جسمانی معطل ہو جاتے ہیں اس لیے وحی و الہام کے ان نئے معترضین نے بلا سوچے سمجھے الہامی کیفیات کو بھی صوفیانہ کیفیاتِ نفسی پر قیاس کر کے یہ فیصلہ دے دیا کہ جن واردات کو ہم الہامی کہتے ہیں وہ بھی معاذ اللہ بعض اعصابی امراض کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس قسم کی لغو باتیں کرنے سے اُن لوگوں کا مقصد بجز اس کے کوئی نہیں کہ انبیاء

علیہم السلام کی پُرکشش شخصیتوں کے لیے لوگوں کے دلوں میں جو جذبۂ احترام موجود ہے وہ یکسر محو ہو جائے اور ان کی مقدس تعلیمات کے متعلق لوگوں کے اندر جو پاکیزہ احساسات پائے جاتے ہیں وہ بھی یکسر ختم ہو جائیں اور اس طرح ان مقدس ہستیوں کے لائے ہوئے سرمدی پیغام کو بالکل بے وزن اور بے وقعت بنا کر رکھ دیا جائے۔

پروفیسر ولیم جیمز نے جو بالاتفاق رائے، امریکہ کے اس صدی کے سب سے زیادہ مستند اور متبحر عالم نفسیات ہیں، اپنی کتاب VARITIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE (تجربات مذہبی کی گوناگونی) میں اس طرز خیال کا نام "طبی مادیت" رکھا ہے اور اس کے اعتراضات پر بڑی گہری نظر ڈالی ہے۔ ذیل میں ہم اسی کتاب کے چند اقتباسات درج کرتے ہیں جن سے ان لوگوں کی حماقت کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"طبی مادیت سینٹ پال کی مذہبیت کا خاتمہ یہ کہہ کے کر دیتی ہے کہ دمشق کی سڑک پر جو مکاشفہ کی حالت ان پر طاری ہوئی تھی وہ "حصن موخری" کے ناسور کی وجہ سے تھی اور وہ صرع کے مریض تھے۔ سینٹ ٹیریسا کے تقدس کا چراغ یہ کہہ کر گل کر دیتی ہے کہ وہ ہسٹیریا کی مریضہ تھیں۔ سینٹ فرانس کو یہ کہہ کر ختم کر دیتی ہے کہ اسفل کی طرف راجع ہونے کا میلان اُن میں موروثی تھا۔ جارج فاکس کو اپنے زمانے کی جھوٹی بناوٹ کی طرف سے جو نفرت تھی اور روحانی صداقت کے لیے اس میں جو بے چینی پیدا ہو گئی تھی اُسے اختلالِ احشاء بتاتی ہے۔ کارلائل کے اقوال میں قنوطیت اور یاس کے جو سُر پائے جاتے ہیں ان کی وجہ امعاء کا اختلال قرار دیتی ہے اور یہ دعویٰ کرتی ہے کہ اس قسم کے تمام نفسی ہیجانات، جس کی مرض پذیری کے نتائج ہیں اور بعض غدودوں کے افعال کے خلل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کے بعد طبی مادیت بڑے فخر و مباہات کے ساتھ کہتی ہے کہ دیکھا میں نے ان تمام بڑی بڑی برگزیدہ ہستیوں کی قلعی کھول کر رکھ دی۔"

ہم اپنی بحث کا آغاز اسی آخری گروہ کے افکار و نظریات سے کرتے ہیں۔ اس گروہ کے حامیوں نے سب سے پہلی حماقت یہ کی ہے کہ ایک متصوف کی قلبی واردات اور ایک نبی کی الہامی کیفیات کے درمیان جو واضح امتیاز ہے اُسے یکسر نظر انداز کر کے دونوں پر ایک ہی حکم لگا دیا ہے حالانکہ ان دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنی کتاب اسلامی الٰہیات کی تشکیلِ جدید میں اس موضوع پر بڑی فکر انگیز بحث کی ہے جسے ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

"محمد عربی برفلک الافلاک رفت و باز آمد۔ واللہ اگر من رفتمے ہرگز باز نیامدمے"

یہ مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے الفاظ ہیں جن کی نظیر تصوف کے سارے ذخیرۂ ادب میں مشکل ہی سے ملے گی۔ شیخ موصوف کے اس ایک جملے میں ہم اس فرق کا ادراک نہایت خوبی سے کر لیتے ہیں جو شعورِ ولایت اور شعورِ نبوت میں پایا جاتا ہے۔ صوفی نہیں چاہتا کہ وارداتِ اتحاد میں اسے جو لذّت اور سکون حاصل ہوتا ہے اُسے چھوڑ کر واپس آئے، لیکن اگر آئے بھی، جیسا کہ اس کا آنا ضروری ہے، تو اس سے نوعِ انسانی کے لیے کوئی خاص نتیجہ مترتب نہیں ہوتا۔ برعکس اس کے نبی کی باز آمد تخلیقی ہوتی ہے۔ وہ ان واردات سے واپس آتا ہے تو اس لیے کہ زمانے کی رو میں داخل ہو جائے اور پھر ان قوتوں کے غلبہ و تصرّف سے جو عالمِ تاریخ کی صورت گر ہیں مقاصد کی نئی دنیا آباد کرے۔ صوفی کے لیے تو لذتِ اتحاد ہی آخری چیز ہے لیکن انبیاء کے لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی اپنی ذات کے اندر کچھ اس قسم کی نفسیاتی قوتوں کی بیداری برقرار ہے جو دنیا کو زیر و زبر کر سکتی ہیں اور جن سے اگر صحیح طور پر کام لیا جائے تو جہانِ نو پیدا ہو سکتا ہے۔ ایک پیغمبر اپنے اندر اس امر کی انتہائی آرزو رکھتا ہے کہ وہ اپنے وارداتِ قلبی کو آب و گِل کی دنیا میں متشکل کرے۔ . . . لہٰذا انبیاء کے مذہبی مشاہدات اور واردات کی

قدر و قیمت کا فیصلہ ہم یہ دیکھ کر بھی کر سکتے ہیں کہ ان کے زیر اثر کس قسم کی سیرت و کردار کے انسان تیار ہوئے اور اسی طرح تہذیب و تمدن کا وہ کونسا پیکرِ محسوس تھا جس کا ظہور اُن کی دعوت سے ہوا۔"

اس طویل اقتباس کے مطالعہ سے یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ ایک نبی کی الہامی کیفیات اور ایک متصوف کی قلبی واردات ایک دوسرے سے بنیادی طور پر مختلف ہوتی ہیں۔ ایک متصوف خارجی ذرائع سے اپنے نفس کو ان کیفیات کے لیے تیار کرتا ہے مثلاً بعض جسمانی ریاضتوں سے، یا موسیقی کی مدد سے، یا دھیان اور سمادھی کے ذریعے سے۔ اور اس حالت کے طاری کر لینے سے اُس کا مقصد محض روحانی اور وجدانی سرور کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے برعکس نبی مصنوعی طریقوں سے اپنے اوپر یہ کیفیات طاری نہیں کرتا اور جب خداوند تعالیٰ اپنی منشا اور مرضی کے مطابق اُس سے ہم کلام ہوتے وقت اُسے جذب و کیف سے سرفراز فرماتا ہے تو وہ ان کیفیات سے خود ہی لطف اندوز ہونے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ بنی نوع انسان کو بھی اس میں شریک کرتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو صوفی کی ریاضت میں ایک طرح کی خود غرضی پائی جاتی ہے اور نبی میں بے نفسی کا پہلو غیر معمولی حد تک نمایاں ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ خداوند تعالیٰ سے حاصل کرتا ہے اُسے دوسرے تک پہنچانے کی پوری پوری فکر کرتا ہے۔ اس اعتبار سے نبی کے کام کو صحیح معنوں میں تخلیقی اور پائیدار کہا جا سکتا ہے۔ نبی کوئی چیز بھی صوفی کی طرح اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا۔ وہ جگہ جگہ اس کے چرچے کرتا ہے، اسے پھیلاتا ہے، اور کمالِ حکمت و دانائی کے ساتھ اُسے لوگوں کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اُن سے اس بات کا بھی مطالبہ کرتا ہے کہ جس تعلیم کو انہوں نے اپنے قلب و دماغ میں جگہ دی ہے وہ اسے عملی طور پر بھی اپنانے کی کوشش کریں۔ حضرت امام ابنِ تیمیہؒ نے اپنی تالیف "النبوات" میں اس موضوع پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ سب سے پہلے انہوں نے

نبوت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے :

"نبی اُس مقدس شخصیت کا نام ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنی منشا اور مرضی بتاتا ہے اور پھر وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دوسروں تک پہنچانے کا فرض بجالاتا ہے"[1]

امام ابن تیمیہؒ کے قول کے مطابق نبی مصلح بھی ہوتا ہے اور اپنے اندر انقلابی داعیات بھی رکھتا ہے[2]۔ وہ ان لوگوں کو فکر و عمل پر اُبھارتا ہے جو حق و صداقت کو جاننے اور ماننے کے باوجود اسے ایک غالب قوت بنانے کے لیے قطعاً کوئی جدوجہد نہیں کرتے اور لاش کی سی بے حسی کے ساتھ فسق و فجور کا غلبہ دیکھتے ہیں اور ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اُن کا ضمیر ظلم و ستم پر کسی قسم کی کوئی خلش محسوس نہیں کرتا۔ نبی ان حالات میں سب سے پہلے لوگوں کے دلوں کو حق و صداقت کے لیے گرماتا ہے، اخلاقی لحاظ سے اُن کی اصلاح کرتا ہے اور اگر لوگ اُس کے اس مقدس پروگرام میں مزاحم ہوں تو وہ پھر قوت و طاقت کے ساتھ اُن کو اپنے راستے سے ہٹاتا ہے۔ (باقی)

---

[1] ابن تیمیہ : النبوات ص ۱۷۲

[2] ایضاً ص ۱۷۳